انتخاب

شریعت کے استحکام کی بنیادیں

اوپر کے عنوان سے ادارہ معارف اسلامی کراچی کے مجلہ "چراغ راہ" بابت ستمبر ۱۹۶۸ء میں ایک مضمون چھپا ہے، جس کے بعض اقتباسات یہاں دیئے جاتے ہیں۔ اصل مضمون عربی میں تھا، جو ایک عربی مجلہ "حضارۃ الاسلام" میں شائع ہوا تھا۔ مضمون نگار شیخ المدنی ہیں اور ترجمہ عارفہ اقبال کا ہے۔ مدیر

قوانین واحکامات اپنے قیام و بقاء کے لئے تین ستونوں کے محتاج ہیں جو یہ ہیں:-

۱- لوگوں کو مکلف کرنے اور ان پر قوانین نافذ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان میں اس قسم کی پابندی کی ضرورت کا احساس موجود ہو۔ دوسرے الفاظ میں معاشرہ میں اس پابندی اور اس قانون کے ضروری ہونے کا ایک عام احساس و شعور پیدا ہوئے بغیر اس کو نافذ کرنا مناسب نہیں ہے۔

۲- پابندی ایک ایسی بالاتر قانونی قوت کی طرف سے ہونی چاہیئے جو یہ حق رکھتی ہو کہ قانون بنائے اور لوگوں کو مکلف کرے۔

۳- لازم ہے کہ یہ پابندی بقدر ضرورت ہو اور اس میں کسی قسم کی زیادتی نہ ہو۔

جب قانون سازی کی عمارت ان تین ستونوں کے اوپر کھڑی ہو اس کی بنیادیں سالم اور مضبوط ہوتی ہیں۔ اور جہاں یہ نہ ہوں وہاں اس کی عمارت ہمیشہ متزلزل رہتی ہے۔ اور موقع ملنے پر انسان خود اس کو گرا دینے کی کوشش کرتا ہے

قرآن کریم میں جو قوانین بیان کئے گئے ہیں، ان میں بنیادی طور پر ان تینوں باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ اب

ہم ایک ایک کر کے ان کا جائزہ لیں گے۔

جس نظام قانون کو قبول کرنے کے لئے لوگوں کے دل آمادہ نہ ہوں اس کا آنا مناسب نہیں ہے۔ معاشرہ میں اس کو قبول کرنے کی ضرورت کا عام احساس موجود ہونا چاہیئے۔ سب جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں تیرہ برس اور مدینہ میں دس برس دعوتِ اسلام کی جد و جہد میں مصروف رہے۔ مکی دور طویل تر ہے۔ لیکن اس عرصہ میں کوئی تفصیلی قانون سازی نہیں ہوئی۔ قرآن کی آیات کا محور توحید کے مبادی رہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے۔ بتوں اور پتھروں کی پوجا انسان کے شایانِ شان نہیں، بلکہ یہ اس کی عقل اور اس کے وقار کے منافی ہے۔ ان فضائلِ اخلاقِ عالیہ پر بھی زور دیا گیا جن پر اسلام معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مکّی دور اسلامی قانون سازی کا دور نہیں تھا۔ یہ صرف بنیادی امور کی وضاحت کا دور تھا۔ اسلام کا منشا یہ تھا کہ پہلے لوگوں کو بُت پرستی اور شرک کی نجاست سے پاک کر کے دلوں کو ایمان کے لئے تیار کر دے۔ اس کے بعد ایک ایسی قوم اور ایسی سلطنت وجود میں آئے جو مفصل قانون کی ضرورت خود محسوس کرتی ہو۔ اگر یہ قانون اسی دور میں نازل ہو جاتا تو عربوں کے لئے اس کا نفاذ آسان نہ تھا اس لئے کہ ابھی ان کو اس کی ضرورت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ بت پرستوں کا ایک ایسا گروہ جو جنگ وجدل قتل و خونریزی اور ڈاکہ و لوٹ مار کا عادی ہو، اس سے چھُوٹتے ہی یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک نظامِ قانون کا پابند کر دیا ہے؟ ہونا یہ چاہیئے کہ پہلے ان کو اللہ کے نام سے روشناس کرایا جائے اور پھر ان میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ جس طرح وہ اپنی پیدائش اور تکلیف میں اللہ کے محتاج ہیں، اسی طرح اپنی زندگی کے قانون اور نظام تہذیب کے لئے بھی وہ اُسی کے محتاج ہیں۔ اس کے بعد قانون کا نزول ہونا چاہیئے

پھر جب نبی اکرمؐ اپنی جماعت کے ساتھ مکّہ سے مدینہ منتقل ہو گئے۔ تو بھی ہم یہ نہیں دیکھتے کہ قانون سازی کا کام بیک دم ہو گیا ہو۔ نہ ہی یہ ہوا کہ مذہبی اور معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں تمام حکم ایک ساتھ آ گئے ہوں اور ایک جامع و مانع کتاب لوگوں کے ہاتھ میں تھما کر کہہ دیا گیا ہو کہ یہ لو صحیفہ، اس میں وہ تمام قوانین موجود ہیں جن کے تم مکلف کئے گئے ہو ____ اگر اللہ چاہتا تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ایک ہی دفعہ میں تمام قوانین نازل ہو جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کیا بلکہ اس نے شریعت کے نفاذ میں تدریج سے کام لیا۔ اس سلسلہ میں شراب اور سود کے متعلق شریعت کے طرز عمل کو میں ذرا وضاحت سے بیان کروں گا۔

مضمون نگار لکھتے ہیں کہ " اللہ تعالیٰ نے شراب کو بیک جنبش قلم حرام قرار نہیں دیا۔ بلکہ شراب کی حرمت کا حکم چار مراحل میں نازل ہوا ..... سود کے معاملہ میں بھی قرآن نے یہی طرزِ عمل اختیار کیا .....

اس تفصیل سے ہمارے اس قول کی صداقت آپ پر واضح ہوگئی ہوگی کہ قرآن کریم نے پوری شریعت کا نفاذ ایک ساتھ نہیں کیا بلکہ اس نے معاشرے کے رجحانات اور ذہنی کیفیات کا پورا پورا لحاظ رکھ کر قوانین کا بتدریج نفاذ کیا۔

اس بات کے ثبوت میں ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ قرآن نے ہر شرعی حکم کے ساتھ اس کی علت اور اس کے محرکات کا بیان بھی کیا۔ یہ وہ نہیں چاہتا کہ لوگوں پر قانون مسلط کر دے اور حکم دے دے کہ بس یہ تمہارا قانون ہے۔ اب اسے مانے بغیر چارہ نہیں۔ یہی تمہاری زندگی کی بنیاد ہونا چاہیئے۔ اس کا اسلوب یہ ہے کہ وہ پہلے لوگوں کو مطمئن کرتا ہے تاکہ وہ برضا و رغبت اس قانون کو قبول کریں۔ اس لئے قرآن میں احکام کی وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً ارشاد ہے: "یسألونك عن المحیض قل هو أذی فاعتزلوا النساء فی المحیض ولا تقربوهن حتی یطهرن"۔

(آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دیجئے یہ گندگی ہے۔ لہذا تم عورتوں سے دور رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں)

یہ تحریم کی وجہ کا بیان ہے کہ یہ گندگی ہے جس سے طبیعت کو انقباض محسوس ہوتا ہے اور جسم کو ضرر پہنچتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو یہ حکم دیتے ہوئے کہ ازواج مطہرات سے صرف پردے کے پیچھے سے بات کر سکتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے :-

"ذالکم اطهر لقلوبکم وقلوبهن" (یہ طریقہ تمہارے اور ان کے دلوں کے لئے پاکیزہ ہے)

صرف یہ حکم نہیں دے دیا گیا کہ یہ میرا حکم ہے اور تمہیں اس کی تعمیل کرنا ہے۔ جس چیز سے میں روک رہا ہوں۔ اس سے باز رہو کیونکہ میں خدا ہوں اور میرا یہ حق ہے کہ اپنے اقتدار و جبروت سے کام لے کر تمہارے لئے قانون بناؤں ۔ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بندوں کو مطمئن کرتا ہے کہ میں نے یہ قانون کیوں بنایا ہے اور یہ حکم کیوں دیا ہے۔ علت کی یہ وضاحت قرآن کے تمام یا اکثر احکام کے ساتھ موجود ہے۔ ابن قیم لکھتے ہیں:- " اگر وہ احکام جن کی علت بیان کی گئی ہے دس بیس یا سو، دو سو ہوتے تو ہم ان کو جمع کر دیتے۔ لیکن تشریعات، اخبار اور عقائد

سے متعلق ایسی آیات کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور ہم اس کتاب میں ان سب کا بیان نہیں کر سکتے۔"

ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ شریعت کے تمام احکام کتاب و سنت میں نہیں آ گئے۔ ان میں سے بعض مصالح اور حالات و ماحول کے اختلاف کی رعایت کرتے ہوئے غور و فکر کے لئے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ اجتہاد ان کی صورت گری کرتا ہے اور قیامت تک کے لئے اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ لیکن شریعت کا ایک پہلو بہر حال ایسا ہے جس میں اجتہاد کا کوئی دخل نہیں اور اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور وہ اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ اللہ ایک ہے، محمدؐ اس کے رسول ہیں، کعبہ تمام مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور وہ "مابین الدفتین" ہے۔ اللہ نے رسول بھیجے ہیں، عیسیٰؑ ایک رسول ہیں اسی طرح الیاسؑ اور اسحاقؑ بھی۔ حشر و نشر اور جنت و دوزخ حقیقت ہیں۔ یہ سب بنیادی اور یقینی باتیں ہیں۔ قرآن میں ان بنیادی امور کے لئے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ مقررہ معانی رکھتے ہیں۔ ان میں اجتہاد کی گنجائش نہیں۔ حالات کے تغیر سے ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اللہ بھی ایک ہے اور کائنات کی تخلیق سے پہلے بھی ایک تھا۔ ایسا بھی نہیں کہ پہلی صدی میں ایک ہو، دوسری صدی میں دو ہو گئے ہوں اور تیسری صدی میں تین (اور اب بیس ہوں!)۔ وہ ازل سے ابد تک ایک ہے اور ایک ہی رہے گا۔ چنانچہ یہ حقیقت محلِ اجتہاد اور مقامِ غور و فکر نہیں البتہ شریعت کے دوسرے کئی پہلو ایسے ہیں جن میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ کئی ایسی عبارات ہیں جن سے مالکؒ کے ذہن میں کوئی ایک مفہوم آتا ہے اور شافعیؒ ان سے دوسرا مطلب سمجھتے ہیں۔ عہد قدیم کا مجتہد اُن سے ایک معنی مراد لیتا تھا اور آج کا مجتہد کوئی دوسرے معنی مراد لیتا ہے۔ اور یہ رحمت ہے۔ مشہور روایت ہے کہ فقہی اختلاف جو اصول سے ہٹ کر فروع میں ہو، خدا کی رحمت ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ یہاں دو نوعیت کی چیزیں ہیں۔ ایک وہ بنیادی اصول جن پر امت متحد ہوتی ہے۔ ہر قوم کو متفق رکھنے والی اور جوڑنے والی کوئی بنیاد ہوتی ہے۔ خواہ وہ زبان ہو، اس کے اخلاق ہوں، اس کی اغراض ہوں یا وہ چیز ہو جس پر وہ ایمان رکھتی ہے! ان چیزوں میں اختلاف کا حق کسی کو نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ مختلف فیہ چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ اور یہ ضروری ہیں۔ اگر اختلاف کا وجود نہ ہو تو ہم اس کی جستجو کریں گے! اس کا دوسرا نام حریتِ فکر ہے۔ انسان کی عقل کے لئے جولانگاہ مہیا کرنا ضروری ہے۔ اسے یہ احساس ہونا چاہیئے کہ وہ ایسی زنجیروں سے جکڑا ہوا نہیں ہے، جنہوں نے اس کی زندگی و موت اور اس کی فکر و احساس کو باندھ رکھا ہو۔ فروع میں اگر کوئی اختلاف نہ ہو تو ہم پیدا کریں گے۔ موجودہ دَور کے ایک لیڈر کا کہنا ہے

کہ اگر اختلاف و معارضہ کا وجود نہ ہو تو میں پیدا کروں گا۔

یہاں ایک اور بات کا ذکر بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ شریعت اسلامیہ نے جب اجتہاد کا دروازہ کھولا اور کچھ مسائل میں اجتہاد کو جائز اور کچھ میں ناجائز ٹھہرایا تو اس کے ساتھ ہی مسائل کی دو نوعیتیں بھی بتا دیں یعنی عبادات اور معاملات — تو عبادات کا مقررہ طریقہ ہے۔ اللہ کی عبادت اسی طرز پر کی جا سکتی ہے جو اس نے بتا دیا ہے۔ میرے لئے یہ جائز نہیں کہ قرب حاصل کرنے یا عبادت کرنے کے لئے خود کوئی نیا طریقہ ایجاد کر کے اس پر عمل شروع کر دوں۔ اللہ نے مجھے ظہر کی چار رکعت پڑھنے کا حکم دیا ہے اور میں زیادتی کر کے آٹھ رکعات پڑھنے لگوں۔ اللہ نے مجھے ایک رکعت میں ایک رکوع کرنے کا حکم دیا ہے اور میں یہ کہوں کہ میں زیادہ ثواب حاصل کرنے کے لئے دو یا تین رکوع کر دوں گا۔ عبادات میں اس قسم کے اختراع کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ ہر عبادت کے بارے میں یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ وہ اللہ ہی نے مقرر کی ہے اور اس کے بارے میں نص وارد ہوا ہے۔ تقرب کی کوشش کرنے سے پہلے یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ کیا اس کا طریقہ اللہ نے بتایا ہے۔ تمام بدعات کو دُور کرنا اور تمام خرافات کا دروازہ بند کرنا مسلمان کا فرض ہے۔ واضح نص اور محکم شریعت کی بنیاد پر ہی اللہ کی عبادت کرنا چاہیئے۔ جب اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ایک مقررہ مہینہ (رمضان) میں روزے رکھ کر اس کی عبادت کروں تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو جولائی، مارچ یا شعبان کے مہینہ میں روزے رکھوں گا۔ بلکہ میں اللہ ہی کے بتائے ہوئے طریقہ پر عبادت کروں گا اور خود سے اپنے لئے کوئی طریقہ مقرر نہیں کروں گا۔ معاملات کی کیفیت یہ نہیں ہے۔ یہ ایک نہایت اہم بحث ہے اور ہمارے دَور کے لئے بے حد مفید اور کارآمد۔ شریعتِ اسلام یا کسی بھی شریعت کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ معاملات کی ایک ایک نوع کا تعین کر دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ جا کر لوگوں کو مقررہ طریقوں پر کاروبار اور تجارت میں شرکت کرتے پایا۔ معاملات مختلف نوعیت کے تھے۔ آپ نے یہ کیا کہ ان معاملات پر نظر ڈالی اور ان کو بنیادی اصولوں پر قیاس کیا۔ پھر جسے صحیح پایا اسے قبول کیا اور لوگوں کو اس کی اجازت دے دی۔ اور جس کو ناقابل اصلاح پایا اسے منسوخ کر دیا۔ اور جس میں نرمی کی گنجائش نکل سکتی تھی اس میں مصالح کے مطابق رخصت عطا کی۔ اور دفع حرج کے لئے بعض قیود و شرائط کو نرم کر دیا۔ اس اصول کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مختلف نوعیت کے معاملات پر غور کر کے ان کے ردّ یا قبول کا فیصلہ کریں۔ معاملات کی اصل حلت اور اباحت ہے۔ اگر وہ شریعت کی روح سے مغائرت نہ رکھتے ہوں تو مباح ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ نے اس چیز کو حرام

قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ اللہ نے کسی شئے کو خود حرام کرنے اور اپنے اوپر جھوٹ باندھنے کی اجازت نہیں دی ہے لیکن ہم غور و خوض کر سکتے ہیں۔ اگر میں کسی چیز کو اسلام کے بنیادی اصول و قواعد اور نصوص صریحہ کے خلاف پاؤں تو رد کر سکتا ہوں۔ بصورت دیگر اسے قبول کروں گا۔

اس مزاج اور اصول کو اپنا کر ہم اپنے تمام اقتصادی معاملات کو طے کر سکتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ شرعی اصولوں پر جانچے بغیر چھوٹی بڑی چیز پر حرام کا ٹھپہ لگا دیں۔

اب میں قانون سازی کے تیسرے اہم نکتہ کی طرف آتا ہوں۔ اور وہ قانون کا بقدر استطاعت ہونا ہے۔ میں نے پابندی قبول کر لی، اسے عائد کرنے والے کے حق اور قانونی اقتدار کو تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد ایک چیز باقی رہ جاتی ہے۔ اس قانون کے احکام میری طاقت سے باہر تو نہیں ہیں؟ کیا میں ان پر عمل کرنے پر قادر ہوں۔ اگر آپ ایسا قانون لاگو کرتے ہیں جو میری برداشت سے باہر ہے تو اگرچہ میں پابندی کی روح کو قبول کر چکا ہوں اور آپ کو صاحبِ امر و نہی اور اپنے معاملہ میں صاحبِ اختیار تسلیم کر چکا ہوں لیکن میں ضرور یہ سوچنے پر مجبور ہوں گا کہ کیا آپ نے میری طاقت و قدرت کو پیش نظر رکھ کر مجھے حکم دیا ہے؟ قرآن ہمیں کوئی ایسا قانون نہیں دیتا جو انسان کی طاقت سے باہر ہو۔

"لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا" "اللہ کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

"لا یکلف اللہ نفسا الا ما آتاھا" "اللہ نفس کو اپنی عطا کردہ طاقت کے بقدر ہی مکلّف کرتا ہے۔"

یہ اسلامی شریعت کا ایک بنیادی اصول ہے جو اس کے تمام فروع میں جاری و ساری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کی روشنی میں مختلف احکامات کا مطالعہ کریں۔ یہ اصول اسلام کی "وسطیت" یعنی اس کا اعتدال ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے:۔

"وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس۔" "اور اس طرح ہم نے تمہیں "امت وسط" بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔"

اعتدال کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر قانون افراط اور تفریط دونوں کے بیچوں بیچ ہے۔ اس کا جھکاؤ نہ دائیں طرف ہے نہ بائیں طرف۔ آپ تعدد ازواج کے بارے میں سوال کریں تو میں کہوں گا کہ اسلام نے تعدد ازواج کی قطعی ممانعت کر کے بعض اجتماعی حالات سے چشم پوشی نہیں کی۔ اکثر ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جو تعدد ازواج کے متقاضی ہوں۔ اسلام نے ان کی رعایت کی ہے۔ بلکہ بعض اوقات واجبات۔ ضروری واجبات

ہوتے ہیں جن کو ادا نہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے بشلاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کے خواص میں سے ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ

"والمومنین والمومنات بعضھم اولیاء بعض یأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر" "مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں"۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایسی قوی رائے عامہ کی موجودگی میں ہے جو باطل کو باطل اور خیر کو خیر کہہ سکے کمزور، خائف اور ڈری سہمی رائے عامہ کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ اسی لئے مومن معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال میں سے ہے" یأمرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر" اس کے ساتھ ہی بعض حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں رخصت عطا کی گئی ہے۔ ابن قیم اپنی کتاب اعلام الموقعین عن رب العالمین" میں لکھتے ہیں: رسول اکرمؐ کا گزر مکہ میں بہت منکرات پر ہوتا تھا لیکن آپؐ ان کو بدلنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ ان پر صبر کرتے یہاں تک کہ آپؐ نے مکہ فتح کر لیا۔ اس وقت آپؐ کا ارادہ ہوا کہ خانہ کعبہ کو قواعدِ ابراہیمؑ پر تعمیر کریں۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا:۔ "اگر تمہاری قوم کا کفر سے باز آنا تازہ بات نہ ہوتی تو میں کعبہ کی تعمیر نئے سرے سے قواعدِ ابراہیمؑ پر کرتا" یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہؐ حکمت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے معاملہ پر غور کرتے تھے اور جس برائی کو روکنے سے کسی بڑی برائی کا خدشہ ہوتا تھا تو نہی عن المنکر سے باز رہتے تھے۔ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ایک دن میرا گزر بغداد پر قابض تاتار کے ایک گروہ کے قریب سے ہوا میں نے ان کی محفل میں شراب کے دور چلتے دیکھے اسی وقت ایک عالم نے ارادہ کیا کہ کھڑے ہو کر ان کو شراب پینے سے روکے میں نے اس سے کہا ان کو نہ روکو، اللہ نے شراب اور جوئے کو اس لئے حرام کیا ہے کہ وہ ذکر اللہ اور نماز سے روکتے ہیں۔ ان لوگوں کو شراب نے خون بہانے اور قتل و غارت گری سے روک رکھا ہے۔ تم ان کو چھوڑ دو۔ نشہ اترنے کی صورت میں یہ جن حرکتوں کا ارتکاب کریں گے، یہ ان سے کم تر درجہ کی برائی ہے"۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایسا فرض ہے جس کی ادائیگی کے لئے خاص صلاحیت کی ضرورت ہے۔ جن میں یہ صلاحیت نہ ہو ان اشخاص کو تمام لوگوں کے درمیان اپنے ذمہ یہ کام لینے کا حق نہیں۔ یہ کام حکمت، بصیرت اور تفقہ کا محتاج ہے؟

کسی وقت اللہ کے حکم سے اس کا واجب کردہ حکم مباح ہو جاتا ہے اور آپ اس کے مکلف نہیں رہتے مثالیں اس کی یہ ہیں، اللہ کی نافرمانی کرنے کی نذر مان لی جائے تو اسے پورا نہیں کیا جائے گا۔ یا کچھ نہ کھانے کی نذر مان لی جائے تو اس نذر کو پورا کرنا جائز نہیں۔ یا نذر مانی کہ مکہ تک پیدل جاؤں گا اور پیدل جانے کی استطاعت نہیں تو یہ نذر پوری کرنا واجب نہیں۔ (جو کوئی قسم کھالے اور اس کے بعد اس سے بہتر چیز دیکھے تو قسم توڑ دے اور بہتر چیز پر عمل کرے۔)

آپ غور کیجئے تو واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی تشریع، حکمت، رحمت استطاعت اور ذہنی کیفیات کا لحاظ رکھنے کی مظہر ہے۔